© rasailojaraid.com





جناب شمشاد حسین فاکر

# امام اہل سنت حضرت مولانا مفتی محمد اسحٰق سندیلوی رحمہ اللہ

مضمون ذیل جناب شمشاد فاکر کی زیر تصنیف کتاب "اشفاق نامہ" کا جزو ہے جو مولانا موصوف کے والد گرامی چودھری اشفاق حسین مرحوم کے سوانح پر مبنی ہے۔ مضمون میں حالات زندگی کے علاوہ مولانا کی شعری و ادبی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس لئے مصنف کی اجازت اور موقع کی مناسبت کی بناء پر مضمون نذر قارئین کیا جارہا ہے۔ کتاب کا یہ حصہ مولانا کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وفات کے حالات بھی شامل مضمون کر دیئے گئے ہیں۔ (ادارہ)

صاحب سوانح کے سب سے بڑے بیٹے مولانا حکیم (چودھری) محمد اسحاق صدیقی تخلص شہید ۱۲ فروری ۱۹۱۳ کو اپنے ننھیال کی حویلی واقع کٹرہ ابو تراب خاں، لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ سندیلہ جائداد کا ہیڈکوارٹر اور بزرگوں کا آبائی وطن تھا مگر ان کی عمر کا بڑا حصہ لکھنؤ میں گزرا۔ قاعدہ بغدادی، ناظرہ قرآن، خوش خطی، عربی فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم مختلف اساتذہ سے گھر پر حاصل کی، جن میں مولوی عبدالحفیظ سرفہرست ہیں (جو والد کے بھی استاد تھے) جن دنوں والد حضرت گنج لکھنؤ میں بحیثیت کوتوال شہر تعینات تھے، ندوۃ العلما، لکھنؤ میں زیر تعلیم رہے۔ یہاں مولانا شبلی اعظمی، مولانا عبدالودود، مولانا محمد سلیم، مولانا محمد عبدالرحمان، مولانا سید علی زینبی اور مولانا عبدالحلیم صدیقی سے استفادہ کیا۔ پھر درس نظامیہ کی تکمیل کے لئے مدرسہ عالیہ فرقانیہ (لکھنؤ) میں داخل ہوئے اور مفتی ظہور احمد شیخ الحدیث، مولانا سید علی زینبی، مولانا محمد اسباط اور قاری عبدالمعبود کے زیر تعلیم رہے۔ یہاں دورہ حدیث، تربیت افتا، اور قرات کے مرحلوں سے گزر رہے تھے کہ ۱۹۲۷ء میں والد کا تبادلہ بحیثیت لکچرر پولیس ٹریننگ اسکول مراد آباد ہو گیا اور وہاں پہنچ کر وہ یکایک علیل ہو گئے۔ مولانا رمضان المبارک میں والد کو دیکھنے مراد آباد گئے اور اس ارادے سے گئے کہ چند دن میں واپس آجائیں گے تاہم والد کے اصرار پر واپسی ملتوی کر دی اور مدرسہ قاسم العلوم، شاہی مسجد، مراد آباد میں داخلہ لے لیا۔ یہاں مفتی مصلح الدین، مولانا عجب نور، اور مولانا محمد میاں جیسے متبحر علماء کی شاگردی میسر تھی۔ مگر یہ ۱۹۲۹ء کی تحریک آزادی اور سول نافرمانی کا دور تھا جس میں اہل مدرسہ بھی شریک تھے، چنانچہ مولانا محمد میاں اور دوسرے علماء کی گرفتاریوں کی وجہ سے تعلیم کا خاصہ نقصان ہوتا رہا۔ مجبوراً اگلے سال والد کی اجازت سے لکھنؤ واپس گئے اور دوبارہ داخلہ لے کر مدرسہ عالیہ فرقانیہ سے مذکورہ بالا مضامین میں تکمیل کے بعد سند فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد منبع الطب کالج لکھنؤ سے جو وقت کے معروف طبیب حاذق، حکیم ہادی رضا ماہر کے زیر انتظام قائم تھا، طب یونانی کی تکمیل کی حمیات اور قانون کی خصوصی تعلیم حکیم خواجہ شمس الدین سے حاصل کی جن کے دست شفا کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس طرح گویا ۱۹۳۵ء میں رسمی تعلیم کا اختتام ہو گیا اور انہوں نے والد کی خواہش پر سندیلہ ہی میں مطب کا آغاز کر دیا۔ اس درمیان "اشفاق منزل" کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی اور والد کا مستقل قیام وہیں تھا۔ والدین مولانا سے بے حد محبت کرتے تھے اور عرصے سے ان کا گھر آباد دیکھنے کے متمنی تھے۔ چنانچہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء (مطابق رجب ۱۳۵۴ھ) کو چودھری محمود علی کی صاحبزادی خدیجہ بیگم سے ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کی شادی ہو گئی (جنھوں نے "۷" اکتوبر ۱۹۸۲ء کو بمقام کراچی انتقال کیا) رفیقہ حیات کی معیت اور مطب کی مصروفیت کے باوجود لکھنؤ جیسے عظیم الشان شہر کے مقابلے میں شاید سندیلہ کے ماحول میں ان کا جی نہیں لگا۔ بعض احباب اور بزرگوں کے مشورہ پر وہ کانپور چلے گئے اور چمن گنج میں مطب شروع کر دیا۔ یہ بہت بڑا شہر تھا ہم مذاق اصحاب بھی میسر آ گئے اور مطب کے بعد خاصی فرصت بھی۔ چنانچہ کچھ عرصے مدرسہ جامع العلوم میں اور کچھ عرصے حلیم مسلم کالج میں جز وقتی درس و تدریس کی خدمات بھی انجام دیتے رہے جو در حقیقت ان کے تبلیغی مشن کی ایک صورت تھی۔ یہیں ہومیو پیتھک سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اسکا مطالعہ بھی جاری رہا لیکن نہ اسے پیشہ بنایا نہ کانپور کے بعد طبابت کو ذریعہ معاش بنایا۔ کانپور کے تین سالہ قیام کے دوران ان کا وقت بہت اچھا کٹا تاہم والد کو ان کا اتنی دور رہنا شاق گزرتا تھا اور اتفاق یہ کہ اسی درمیان وہ خاصے بیمار ہو گئے۔ چنانچہ مولانا کو وطن واپس جانا پڑا اور والد کی خواہش کے مطابق انہوں نے کانپور کو خیر باد کہ دیا۔

۱۹۴۳ء میں مولانا سید سلیمان ندوی نے جو اس زمانہ میں "ندوۃ العلما" لکھنؤ کے ناظم اعلیٰ تھے، انہیں باصرار طلب کیا اور اسلام کے سیاسی نظام پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کی فرمائش کے ساتھ دارلعلوم میں بحیثیت استاد کام کرنے کی دعوت دی۔ لکھنؤ ایک طرح مولانا کا وطن ہی تھا۔ سندیلہ سے بمشکل ایک گھنٹہ کی مسافت تھی۔ لہذا والد نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ انہوں نے یہ پیشکش منظور کر لی۔ یہاں تقریباً ۲۶،۲۷ سال اعلیٰ درجات میں تدریسی کتب کے علاوہ منتہی طلبا کو جدید علوم وفنون مثلاً (سیاسیات و معاشیات) کی تعلیم دیتے رہے جن کا عام عربی مدارس میں رواج نہیں تھا۔ اس کے علاوہ دارالاقامہ کی نگرانی اور طلبا کو چاق چوبند رکھنے کے لئے کھیل کود اور ورزش کا اہتمام بھی ان کے فرائض میں داخل تھا۔

۱۹۴۵ء کے ابتدائی چند مہینوں کے دوران ہندو مسلم سیاسی کشمکش میں تشدد کا رجحان شدت اختیار کر چکا تھا۔ بالخصوص مشرقی پنجاب کی چند غیر مسلم بڑی ریاستیں پورے ملک پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہی تھیں اور جیسے جیسے آزادی کی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں مسلم اقلیت کے خلاف ایک خونی انقلاب کے آثار واضح ہوتے جا رہے تھے۔ حالات کے مشاہدے، دین کی محبت اور امتہ مسلمہ کی خیر خواہی نے بالآخر انہیں مجبور کر دیا۔ انہوں نے مدرسہ سے اجازت لی اور نیم فوجی تربیت کے لئے بھوپال چلے گئے۔ تاہم اس تربیت کا مقصد نہ تو برادران وطن سے برسرپیکار ہونا تھا نہ جنگجوئی کے لیے کوئی تنظیم بنانا، البتہ خود حفاظتی اور دفاع کے لیے عملی صلاحیت پیدا کرنا ضرور تھا جو بعد میں کام بھی آئی۔ اہل وطن بالخصوص اہل لکھنؤ بلکہ بلا تخصیص مذہب علاقے (اودھ) کے امن پسند اور شائستہ مزاج شہریوں کی بدولت آگ اور خون کے دریا سے گزرنے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ بہر حال ۱۹۴۶ء میں وہ ایک سال کی تربیت مکمل کر کے بھوپال سے واپس آ گئے اور بدستور تعلیم و تعلم کے فرائض میں مشغول ہو گئے اور مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے ۱۹۷۰ء میں جب وہ دارالعلوم کے عمید (مہتمم) کی حیثیت میں کئی سال سے کام کر رہے تھے مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم نے اپنے مدرسہ جامعتہ العلوم بنوری ٹاؤن کراچی کے لیے انہیں بڑے اصرار کے ساتھ بار بار طلب کیا۔ ۱۹۶۲ء میں والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ بھائی بہنیں سب پاکستان میں تھے۔ والدہ بھی اولاد کی للک میں پاکستان جا چکی تھیں، اس لیے انہوں نے مولانا بنوری کی دعوت قبول کر لی کراچی آ گئے اور ابتداءً مدرسہ میں "تخصص فی الفقہ" کے [illegible] کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ بعد میں جب مولانا بنوری نے ان کی علمیت سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


استفادہ کی خاطر ایک نیا شعبہ التخصص فی الدعوۃ والارشاد، کھولا تو اسکے مشرف مقرر ہوئے اور تقریباً آٹھ ۸ سال تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔ مولانا بنوری کے وصال کے بعد انہیں شدت سے یہ احساس ہونے لگا کہ عوام و خواص کی اصلاح اور تبلیغ کا کام جسے وہ زندگی کا مشن تصور کرتے تھے ملازمت کی پابند زندگی کے مقابلہ میں زیادہ توجہ، وقت اور آزادی چاہتا ہے، لہذا مدرسہ کی ملازمت سے دست بردار ہو گئے۔ اب بطور خود تصنیف و تالیف، تدریس قرآن اور وعظ و نصیحت میں مشغول رہتے ہیں۔ اسکے علاوہ "جامعہ مدینتہ العلوم" اورنگ آباد (ناظم آباد کراچی) کی درخواست پر، حسبتہ اللہ افتا کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مدرسہ بنوری ٹاؤن اور اس کے اساتذہ سے رابطہ و تعلقات بدستور قائم ہیں۔

## شاعری

شاعری میں معروف ماہر زبان شاعر، خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی کے شاگرد ہیں جن کا شمار اساتذہ لکھنو میں ہوتا ہے لیکن اس سے بڑی بات یہ ہے کہ ان میں شعر کو فنی اعتبار سے پرکھنے اور برتنے کا ایک خاص سلیقہ ہے جو شعر کہنے، بلکہ اچھا شعر کہنے اور تنقید و تبصرہ کی ماہرانہ صلاحیت کے باوجود ہر ایک کو میسر نہیں آتا۔ میرے کلام (ان کہی) پر تبصرہ کے سلسلہ میں ایک موقع پر "غزل" اور "موضوعاتی نظم" کے فرق کو انہوں نے جس لطیف پیرایہ میں واضح کیا ہے، انہیں کا حق ہے اور اس سے ان کی شعر فہمی اور شعر گوئی کی غیر معمولی صلاحیت کا اندازہ ہو سکتا ہے لکھتے ہیں۔

"بوستان شعر و شاعری میں بھی پھولوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ ایک غزل کا چمن ہے، اس کے مقابل دوسرا چمن نظم کا ہے۔ دونوں کے پھول دلکش، دلآویز ہوتے ہیں، مگر تاثیر اور طریق تاثیر میں فرق ہوتا ہے۔ غزل کے ہر شعر میں یہ وصف ہونا چاہیئے کہ وہ سامع کو شاعر کے عالم نفسی میں اس کا ہم نشین بنا دے، مگر نظم کے کمال کا رنگ دوسرا ہے۔ اگر نظم کا ہر شعر اس وصف سے متصف ہو تو مجموعے کا اثر حد سے گزر جائے گا اور سامع ان حدود کو پار کر جائے گا۔ جہاں شاعر اسے لیے جانا چاہتا ہے۔ نظم کا کمال یہ ہے کہ وہ تدریج کے ساتھ وہ عالم نفسی طاری کر دے جو شاعر طاری کرنا چاہتا ہے اور جو خود شاعر پر طاری ہے۔ جب نظم ختم ہو تو اس کا مجموعی اثر نفسی حیثیت سے سامع کو شاعر بنا دے۔ ناظم ہلکی ہلکی پھوار ڈال کر بالآخر سامع کو شرابور کر دیتا ہے۔ غزل موسلا دھار بارش کی طرح ابتدا ہی سے بھگو دیتی ہے۔ غزل اور نظم کے اس فرق کا ادراک کرنے والے بہت کم ہیں اور نظم میں یہ کمال پیدا کرنے والے اور بھی کم ہیں۔"

مذکورہ بالا عبارت کا حوالہ دینے سے میرا مقصد صرف اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا ہے کہ مولانا محض روایتی غزل گو شاعر نہیں، غزل گوئی کے فن اور واردات قلبی کے اشتراک سے ان کا ہر شعر دل کو چھیڑتا ہے اور ذہن کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔ افسوس ہے کہ انہوں نے "بیاض" کا اہتمام نہیں کیا ورنہ عشق الہی اور حب رسول ﷺ میں ڈوبے، اور لکھنؤ کی نرم اور شگفتہ زبان میں ڈھلے ہوئے اشعار کا خاصا ذخیرہ میسر آ جاتا۔ نوجوانی کے اشعار میں سے انہیں بمشکل چند شعر یاد ہیں۔ جن پر نہ صرف یہ کہ استاد سے "خلعت" ملا ہے بلکہ استاد کا ------ یا یہ کہئے کہ اب سے ساٹھ سال پہلے والے لکھنؤ کی شاعری کا رنگ غالب ہے۔

© rasailojaraid.com